

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

## اشارات

پچھلی صحبت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ جماعت اسلامی جس دعوت پر قائم ہوئی ہے اس کا مقصد اول روز سے یہ تھا کہ دینِ حق کو اس کی اصلی اور مکمل صورت میں پورے نظامِ زندگی پر غالب کیا جائے۔ اس مقصد کے مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کے مختلف انجیال اشخاص اور گروہوں کو جس جس نوعیت کے اختلافات ہیں ان کی طرف بھی مختصر اشارات کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ سال میں یہ تحریک کن مراحل سے گزرتی ہوئی آرہی ہے۔ اس بیان سے مقصود محض تاریخ نگاری نہیں ہے۔ دراصل جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے نصب العین کے لئے ہم نے اب تک جو کام جس طرح کیا ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو۔



۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب اس تحریک کا آغاز ہوا اس وقت ہمارے سامنے اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنایا جائے۔

عام انسانوں کے بجائے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو ہم نے اس لئے خطاب کیا کہ دنیا میں مسلمان اسلام کے جیتے جاگتے نمائندے ہیں، خواہ وہ اپنی اس حیثیت کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، بہر حال دنیا ان کو نظر انداز کر کے خالص اور مجرد اسلام کو محض الفاظ کی مدد سے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کو جب کبھی اسلام کی طرف دعوت دی جائے گی، اس کی نگاہ لامحالہ ان لوگوں کی طرف اٹھے گی جو پہلے سے اس دین کے پیرو ہیں۔ اور اگر وہ اپنی زندگی میں انسانیت کا کوئی دلکش نمونہ پیش نہ کر رہے ہوں تو دنیا سے یہ توقع کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اس دین کے اتباع سے اپنی فلاح و بہبود کی امیدیں وابستہ کرے گی۔ اس لئے دنیا میں نظامِ حق برپا کرنے کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ اگر سارے مسلمان نہیں تو کم از کم ان میں کوئی ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہو جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہو۔

مسلمانوں میں سے بھی عوام کو چھوڑ کر خاص طور پر ہم نے ان کے اہل دماغ طبقے کو خطاب کیا، کیونکہ ایک قوم کے اصل رہنما اس کے اہل دماغ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ زندگی میں جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں عوام ان کے پیچھے اس راستے پر چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے عام مسلمانوں کی اعتقادی و عملی اصلاح سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنی کوششوں کو ان خواص کی اصلاح پر مرکوز کر دیں جو اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لئے بھی ضروری تھی کہ معاشرے کی عام اصلاح کے لئے جو کام ہم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے کارکن ہم کو بہر حال اہل دماغ طبقے ہی سے مل سکتے تھے۔

پھر اصلاح کے معاملے میں بھی ہم نے اخلاقی و عملی اصلاح پر فکری و ذہنی اصلاح کو مقدم رکھا کیونکہ خیال ہی اخلاق و کردار کی جڑ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں کوئی عملی تغیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نظریات تبدیل نہ ہوں، اس کے سوچنے کا انداز نہ بدلے، اور اس کی اقدار نہ بدل جائیں۔



یہ تھا اس دعوت کی راہ میں ہمارا پہلا قدم۔ یہ خالص تنقید اور تبلیغ و تلقین کا مرحلہ تھا جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک پورے ۹ سال رہا۔

اس میں ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے ان اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور ان اثرات پر بھی جنہیں آج ہم اپنی زندگی میں لئے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے ان کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا، اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مدارس فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمہور کے حامیوں پر بھی اور اجتہاد مطلق کے مدعیوں پر بھی۔ حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں خلو کرنے والوں پر بھی۔ دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارے پیش نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحب فکر لوگوں کی ان ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لئے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اُس کی شاہراہ کو صاف صاف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لئے

جب کبھی ہماری تنقیدوں پر مدغم کر کسی نے ہم کو بحث میں الجھانا چاہا۔۔۔۔۔ اور اس کی فوجت بار بار آئی ہے۔۔۔۔۔ تو ہم نے اس کے ساتھ الجھنے سے انکار کر دیا، کیونکہ ہمارے لئے یہ بحثیں مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ اپنے نصب العین کی راہ صاف کرنے کے لئے ہم نے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر انہیں اختیار کیا تھا اور ہم ان میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔



دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظام زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں۔ اس کا نظریہ کائنات و انسان کیا ہے۔ اس کا فلسفہ اخلاق کیا ہے۔ اس کی عبادات کس غرض کے لئے ہیں۔ وہ انسانی میرٹ و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لئے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے۔ اس کے مزاج سے کس قسم کا نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا رہا ہے اور آج کس طرح کر سکتا ہے۔ اس کے نظام زندگی کو برپا کرنے کے لئے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں۔ مگر اس کام سے ہمارا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا نہ تھا بلکہ اول روز سے ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد نہیں وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔ اسی لئے ہم ہر قدم پر دعاؤں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اسانے کی بھی کوشش کرتے رہے، اور ایمان کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پاسکتا، لہذا جو لوگ بھی سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انہیں دنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لئے سر و عطر کی بازی لگانے پر تیار ہونا چاہئے۔



اس مرحلے کے کام کو جو لوگ بھی طرح سمجھنا چاہیں وہ اگر ہماری مطبوعات کو ذیل کی تاریخی ترتیب کے ساتھ مطالعہ فرمائیں تو ان کے سامنے وہ پورا نقشہ واضح ہو سکتا ہے جس پر شروع سے اللہ کے اختتام تک کام کیا گیا:

۳۳۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی مسد مجر و قدر۔

۳۴۔ ۳۸۔ تنقیحات۔ تہنیمات حقہ اول و دوم۔

۳۵۔ حقوق الزوجین۔ اسلام اور ضبط ولادت۔

۳۶۔ ۳۷۔ رسالہ دینیات۔ سود۔ پردہ۔

۳۸۔ خطبات۔

۳۹۔ اسلام کا نظریہ سیاسی۔ اسلامی جہادات پر ایک تحقیقی نظر۔

۴۰۔ تجدید و احیاء دین۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ ایک اہم استفتاء۔

۴۱۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں اسلام اور جاہلیت۔ نیا نظام تعلیم۔ انسان کا معاشی مسد اور اس کا اسلامی حل۔



شاید یہ مرحلہ ابھی کچھ اور دراز ہوتا، لیکن اس دوران میں ملک کے سیاسی حالات جو پلٹا کھا رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ مزوری ہو گیا کہ بغیر کسی مزید تاخیر کے دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھائیں۔

انگریزی حکومت نے انیسویں صدی کے دورِ آخر سے ہندوستان میں جمہوری ادارات قائم کرنے اور باشندگان ملک کو حکومت کے اختیارات میں حصہ دار بنانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی پوری بنیاد جمہوریت کے ان قاعدوں پر بنی تھی جو خود انگریزوں کے اپنے گھر میں رائج تھے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ انگلستان کی طرح ہندوستان کے باشندے بھی بلا امتیاز مذہب و ملت ایک قوم ہیں اس لئے یہاں بھی انگلستان کے نمونے پر ایک ایسی جمہوری حکومت بن سکتی ہے جس میں اکثریت کے نمائندے ملک کا انتظام اپنی صواب دید کے مطابق چلائیں اور اقلیت کے نمائندے حزب اختلاف میں رہتے ہوئے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنا مخصوص تمدنی و سیاسی فلسفہ بھی رکھتے تھے جسے انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے ایک نئی حیثیت دے رکھی تھی، اور وہ یہ تھا کہ مذہب کا تعلق صرف انفرادی عقیدہ و عمل سے ہے، ریاست کو لازماً غیر مذہبی (سیکولر) ہونا چاہیے۔ یہ نظریات، جن پر ملک کا نظام ڈھالا جا رہا تھا اور جن کے مطابق ہر ایک نئی ترقی کے ساتھ زیادہ اختیارات اکثریت کی طرف منتقل ہوتے چلے جا رہے تھے، اس قوم کے مفاد کے عین مطابق تھے جو ہندوستان کے افسوس ہے کہ یہ سلسلہ معنائیں بھی تک ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں میں دفن ہے! اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا نوبت نہیں آ سکی ہے۔

کی آبادی میں اکثریت رکھتی تھی، اس لئے اس نے نہ صرف انہیں قبول کیا بلکہ وہ ان کی زبردست حامی اور وکیل بن گئی جتنا پختہ ذہنی نشیونے کا نگرین کی پوری تحریک اول روز سے قائم ہی اس بنیاد پر ہوئی تھی کہ انہی نظریات کے مطابق ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی جدوجہد کرے لیکن مسلمان، جن کے لئے اس ”قومی، جمہوری، لادینی ریاست“ کے نظریہ کا ہر جزو زبردست قاتل کا حکم رکھتا تھا، مسلسل تذبذب میں مبتلا رہے اور اپنے لئے کوئی صحیح راستہ تجویز نہ کر سکے۔ اول اول انہوں نے کوشش کی کہ مہرے سے حکومت کے اختیارات باشندوں کی طرف منتقل ہی نہ ہوں بلکہ تمام اختیارات انگریز حکمران اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ پھر جب یہ پالیسی چلتی نظر نہ آئی تو انہوں نے واحد قومیت کی بنیاد پر جمہوری حکومت کے اصول کو تسلیم کر لیا اور صرف اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح اس نظام میں ان کے لئے ایسے آئینی تحفظات رکھ دیے جائیں جن کی پناہ میں وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکیں۔ پھر وہ بیکار خلافت کے زلزلے میں ہندو مسلم اتحاد کا نعرو لگانے لگے اور اکثریت کے اعتماد پر بالکل اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر آئینی تحفظات کے مطالبے کی طرف رجوع کیا اور اس سوال پر رفتہ رفتہ ان کے اندر بھوٹ پڑنی شروع ہو گئی۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ پہلے اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کر لی جائے، پھر ”تحفظات“ کا سوال چھیڑا جاسکتا ہے، اور دوسرا گروہ اس صراحت پر قائم رہا کہ پہلے تحفظات کا معاملہ طے کر لیا جائے پھر حصول آزادی کے لئے اکثریت کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بات دونوں گروہوں میں بہر حال متفق عینہ یہی کہ انہیں درکار صرف ایسے آئینی تحفظات ہیں جو ایک ”قومی جمہوری لادینی ریاست“ میں ان کے مستقل قومی وجود اور ان کی جداگانہ دینی تہذیب کو زندہ رکھ سکیں۔ یہ بات ان دونوں گروہوں میں سے کسی کو بھی نہ سمجھی کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے اس کے اندر کسی گروہ کی جداگانہ قومیت باقی نہیں رہ سکتی، اور ایک لادینی ریاست میں کسی دینی تہذیب کا نشوونما پانا ناممکن نہیں ہے۔



یہ حالات تھے جب ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بنا اور ۱۹۳۷ء میں اس کا وہ حصہ ملک میں نافذ ہوا جس کی رو سے صوبوں کو ذمہ دارانہ حکومت کے وسیع اختیارات دئے گئے تھے۔ اب یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ عارضی دور عنقریب ختم ہونے والا ہے جس میں ایک بیرونی قوم کے ہتھی بھرا فراڈ یہاں حکومت کر رہے تھے اور وہ مستقل دور شروع ہونے والا ہے جس میں واحد قومیت، جمہوریت اور لادینی کے اصولوں پر اسی ملک کی اکثریت یہاں حکومت کرے گی۔ اس موقع پر ہمارے لئے یہ فریضہ ہو گیا کہ اس آلے والے دور کے خطرات مسلمانوں کے سامنے صاف صاف کھول کر پیش کر دیں، کیونکہ ہمارے سامنے یہ

بات بالکل واضح تھی کہ اس نظام میں کوئی آئینی تحفظ مسلمانوں کو اور ان کی تہذیب کو اکثریت اور اس کی تہذیب میں گم ہونے سے نہ بچا سکے گا اور اس صورت میں ہمارے لئے اپنے نصب العین کا حصول اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہو جائیگا چنانچہ اسی خطرے کو محسوس کر کے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ء تک مسلسل تین سال ان صفحات میں وہ مضامین لکھے جاتے رہے جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش "حصہ اول و حصہ دوم اور "مسئلہ قومیت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں ہم نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ اگر انھوں نے واحد قومیت کا اصول تسلیم کر کے ایک جمہوری لادینی نظام کے قیام کو قبول کر لیا تو یہ ان کے لئے خود کشی کا ہم معنی ہوگا۔

ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان تین سالوں کے دوران میں مسلمانوں کے اندر کانگریسی نظریہ کا زوال اور اپنی جداگانہ قومیت کے احساس کا نشوونما جو کچھ بھی ہوا وہ ہماری ان کوششوں کا نتیجہ تھا، مگر اس بات سے شاید ہمارا کوئی مخالف بھی سچائی کے ساتھ انکار نہیں کر سکتا کہ نتیجہ کے ظہور میں کچھ ہماری کوششوں کا دخل بھی تھا۔



اس کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ نازک سوال حل طلب تھا کہ وہ اس پیچیدگی سے کس طرح نکلیں جس میں ملک کے سیاسی ارتقائے ان کو متاثر کر دیا ہے۔ کانگریسی مسلمانوں کا نظریہ اب ان کے لئے قابل قبول نہ رہا تھا۔ یہ بات بھی اب وہ سمجھ چکے تھے کہ واحد قومیت کے اصول پر جمہوری نظام بنے گا اس میں کوئی آئینی تحفظ ان کے کام نہیں آ سکتا۔ مگر اب اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟ یہ سوال سخت پریشان کن تھا! ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ تقسیم ملک کا مطالبہ کیا جائے اور ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر لیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن بہت سے لوگوں کو، جن میں ابتداً خود مسٹر جنرل مرحوم بھی شامل تھے، اس حل کو قبول کرنے میں اس بنا پر تامل تھا کہ یہ صرف آدمی قوم کے مسئلے کو حل کرتا ہے، بقیہ آدمی قوم، جو ہندوستان کے بڑے حصے میں کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے بالکل اکثریت کے رحم پر چھوٹ جاتی ہے۔

اس موقع پر ہم نے ۱۹۳۹ء میں ایک در سلسلہ مضامین شروع کیا جو ۱۹۴۹ء میں مسلمانوں اور موجودہ سیاسی کشمکش "حصہ سوم" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ہم نے مسلمانوں کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ آپ جس پیچیدگی میں اپنے آپ کو اس وقت مبتلا پارہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے مسلمان کو محض ایک قوم سمجھ لیا ہے، اور قوم ہونے کی حیثیت سے آپ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت میں آپ کی طاقت کا مدار صرف تعداد پر ہے۔ اسی لئے آپ اس دو گونہ مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ اگر ہندوستان ایک ہوتا تو آپ کی پوری قوم

فنا ہوتی ہے اور اگر تقسیم ہوتا ہے تو اسی قوم کو قیمت میں دینا پڑتا ہے لیکن درحقیقت آپ محض ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک اصول اور ایک نظریہ کی حامی جماعت ہیں۔ آپ کی حیثیت جرمن، فرنگ اور انگریز کی طرح ایک نسلی قوم کی سی نہیں ہے، بلکہ سٹوٹسٹ اور کیونسٹ کی طرح ایک اصولی پارٹی کی سی ہے پچھلی صدیوں میں آپ اپنے اصولوں کی طاقت سے ملک کے ملک جیت چکے ہیں خود ہندوستان میں بھی جو کورٹوں مسلمان نظر آتے ہیں وہ اسی اصولوں سے سخر ہوئے تھے۔ لہذا اگر آپ قومی حقوق اور قومی مفاد کے بجائے اپنے اصول اور اپنے نظریہ حیات کے لئے جدوجہد شروع کر دیں تو صرف یہی نہیں کہ ہندوستان میں آپ مٹائے نہ جاسکیں گے، بلکہ اس امر کا بھی نہایت قوی امکان ہے کہ چند سال کے اندر پورا ہندوستان دارالاسلام بن جائے۔ کیونکہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم یا پارٹی کے پاس اتنے جاندار اصول موجود نہیں ہیں جیسے اسلام نے آپ کو دئے ہیں۔



ہم نے اس خیال کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ پیش کیا اور کوشش کی کہ مسلمان اسے اپنالیں لیکن قوم کی سب سے بڑی اکثریت کو اس نے اپنایا نہ کیا۔ شکریہ میں مسلم لیگ نے اپنا وہ مشہور ریزولوشن پاس کر دیا جس میں پاکستان کو مسلمانوں کا قومی نصب العین قرار دیا گیا تھا اور لگتہ تک پہنچنے پہنچنے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اس کو اپنا مطمح نظر بنا چکے ہیں۔

اب ہمارے سامنے دو نہایت اہم اور نازک سوال غور طلب تھے! ایک یہ کہ اگر ملک تقسیم ہو تو ہندوستان کے بڑے حصے میں جو کورٹوں مسلمان رہ جائیں گے ان کے اندر اسلام کی شمع روشن رکھنے اور اس کے نور کو پھیلانے کی کیا صورت ہوگی؟ دوسرے یہ کہ اگر پاکستان اسی لیڈروں کی رہنمائی میں قائم ہو جو اس وقت اس تحریک میں پیش پیش ہیں تو اس کو ترکی کی طرح ایک دینی ریاست بننے سے بچانے اور ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لئے کیا تدبیر کی جاسکتی ہے؟ ہمارے نزدیک یہ دو سوالات اس قدر اہم تھے کہ اس بزرگ عالم میں اسلام کے مستقبل کا انحصار اسی کے صحیح حل پر موقوف تھا۔ ہم نے ان پر مہینوں غور و فکر کیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ان تمام لوگوں کو تنظیم کرنے کا وقت آ گیا ہے جو پچھلے ۹ سال میں ہمارے دعوت سے متاثر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں ان کو جمع کیا گیا اور "جماعت اسلامی" کی بنا ڈالی گئی۔ اس تنظیم سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اسی وقت سے ایک ایسے تنظیم اور تربیت یافتہ گروہ کو تیار کرنا شروع کر دیا جائے جو اس بزرگ عالم میں اسلام کے خلیے کے لئے کام کرنے کے قابل ہو۔ اگر خدا نخواستہ مسلمان تقسیم ملک کی جدوجہد میں ناکام ہو جائیں تو یہ گروہ اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے، اور اگر ملک تقسیم ہو جائے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یہ گروہ اسلام کا علم بلند کرنے کے لئے تیار رہے۔

اسی طرح ہماری یہ دعوت دو سرے مرحلے میں داخل ہوئی۔